

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

اشارات

اس مرتبہ ترجمان القرآن میں "تفہیم القرآن" کا حصہ شائع نہیں ہو رہا اس کی وجہ، جیسا کہ احباب کو معلوم ہی ہے، محترم مولانا مودودی کی علالت ہے۔ ثانی مطلق کے حضور میں دعا ہے کہ وہ مولانا کو جلد از جلد مکمل طور پر صحت یاب فرمائے تاکہ وہ دینی امور و مشاغل کی انجام دہی میں حسبِ معمول منہمک ہو سکیں۔ ان کی علالت پاکستان کے دینی حلقوں کے لیے ہی نہیں بلکہ پوری دنیائے اسلام کے لیے سخت وجہِ اضطراب ہے خصوصاً موجودہ پریشان کن حالات میں اسلامی محاذ پر ان کی سخت ضرورت محسوس کی جا رہی ہے اور جو لوگ اس محاذ پر کام کر رہے ہیں وہ ہر قدم پر اپنے آپ کو ان کی رہنمائی کے محتاج پاتے ہیں۔ ترجمان القرآن کے قارئین سے درخواست ہے کہ وہ مولانا کی صحت یابی کے لیے دعا فرمائیں۔

اس وقت ملک جس شدید بحران سے گزر رہا ہے یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں جو اچانک ملک میں رونما ہو گیا ہے بلکہ یہ فطری نتیجہ ہے ان غیر اسلامی رجحانات اور قوتوں کا جو اس ملک میں عرصہ دراز سے کام کر رہی ہیں۔ یہ وقت اب کسی کو کوسنے یا ایک دوسرے پر الزام لگانے کا نہیں بلکہ اس امر کا جائزہ لینے کا ہے کہ وہ کونسے اسباب اور کوتاہیاں تھیں جن کی وجہ سے ملک اس مصیبت میں گرفتار ہوا ہے۔ یہ قائدین جنہیں اس وقت مورد الزام ٹھہرایا جا رہا ہے یا جن کی بے تدبیری اور سہٹ دھرمی کو ان وجوہِ نزاع حالات کا ذمہ دار قرار دیا جا رہا ہے۔ انہیں خود اپنی غلط رجحانات کے ریلے نے اُجھارا ہے۔ اگر

ملک صحیح راہ پر گامزن ہونا تو پھر ان کے اُبھرنے کے کوئی امکانات نہ تھے۔ اس وقت اس ملک کو یہی نہیں بلکہ پوری
دنیا نے اسلام کو دو چیزوں کی ضرورت ہے ایک انابت الی اللہ اور دوسرے تدبیر و تفکر اور حالات کی صحیح
سمجھ بوجھ اور تعمیری کام کے لیے نچتہ عزم۔

اگر تاریخ کا اپنے آپ کو دہرانا ایک مسلمہ حقیقت ہے تو پھر اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہم آج حوادث
کے اسی دور میں سے گذر رہے ہیں جو خلافت عثمانیہ کے خاتمے کے وقت مسلمانوں کو پیش آئے! اس خلافت میں لاکھ
خامیاں سہی مگر یہ بات تو اپنی جگہ مسلم ہے کہ اس سے مسلمانوں کے اندر یہ احساس تو کسی نہ کسی طرح قائم تھا کہ ان
کی شیرازہ بندی خاک و خون کے رشتوں سے نہیں ہوئی بلکہ خالص روحانی بنیادوں پر ہوئی ہے۔ اس احساس کے
یوں تو مستند و فوائد تھے مگر تین خاص طور پر نمایاں ہیں: ایک یہ کہ مسلمان خواہ کسی ملک قبیلے، رنگ اور نسل سے
تعلق رکھتا تھا مگر اُس کے اندر اس خلافت کی وجہ سے یہ احساس پوری طرح موجود رہتا تھا کہ وہ چونکہ ایک
بین الاقوامی برادری کا کون ہے اس لیے اُسے وطنی اور نسلی مفادات سے بلند تر ہو کر سوچنا چاہیے۔ گذشتہ
دو تین سو سال میں وہ کونسی ایسی اُفتاد ہے جو مسلمانوں پر نہیں پڑی۔ مغربی قوموں نے انہیں غلام بنایا، انہیں
دنیا میں ذلیل و خوار کیا، ان کی دولت کو دولتوں ہاتھوں سے لوٹا، ان پر ناقابل بیان مظالم ڈھائے مگر ان
سارے مصائب کو مسلمانوں نے یک جان ہو کر برداشت کیا اور ایک خطرہ ارضی میں رہنے والے خدا کے بندوں
نے اپنے دکھوں کو نظر انداز کرتے ہوئے دوسرے ممالک میں بسنے والے اپنے بھائیوں کی پریشانیوں کو زیادہ
شدت سے محسوس کیا اور انہیں اپنے محدود وسائل کی حد تک دُور کرنے کی کوشش کی۔ انہیں اپنی مظلومیت
سے کہیں زیادہ اپنے بھائیوں کی مظلومیت کی فکر دامنگیر رہتی تھی۔ اس حدیث کی مکمل تصویر نہ سہی مگر ایک
حد تک مسلمانوں کے اس احساس کو دیکھتے ہوئے اس صادق و صدوق صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ضرور سامنے
آجاتا ہے کہ یہ امت جسد واحد کی مانند ہے جس کے اگر کسی عضو کو تہی کلہیف ہو تو پورا جسم ایک کرب محسوس
کرتا ہے۔

اس احساس کا دوسرا فائدہ یہ تھا کہ جس دین کی بدولت انہیں ایک بین الاقوامی برادری بننے کا شرف حاصل ہوا ہے وہ اس کے بارے میں حدودِ رجحانات اور حساس رہنے اور اس پر کسی قسم کی آپریشن نہ آنے دیتے کیونکہ وہ بالکل صحیح طور پر سمجھتے تھے کہ ان کی اجتماعی زندگی صرف اس دین کی رہیں مستند ہے مگر اس میں کوئی ضعف پیدا ہو گیا تو ان کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ چنانچہ اس ملت کے ہی خواہ ہمیشہ اس بات کا اہتمام کرتے رہے کہ مسلم قوم کا اس دین سے تعلق بڑا گہرا ہو اور دنیا کے سارے مسلمان صلیبۃ اللہ میں رنگ جاتیں۔ اس غرض کے لیے مختلف دینی تحریکات مختلف طبقات اور مختلف حلقوں میں برابر سرگرم عمل رہیں۔ وہ ایک طرف تو مسلمانوں کے اندر دین کی شمع روشن رکھنے کی کوشش کرتیں اور دوسری طرف اس بات کا بھی خاص طور پر خیال رکھتیں کہ الحاد اور بے دینی کی تاریکیاں ان پر طغیا کر کے کہیں ان کی زندگیوں کو تاریک نہ بنا دیں چنانچہ جاہلیت کی ان تاریکیوں سے مسلمانوں کو بچانے کے لیے اس ملت کے خیر خواہوں نے ہر میدان میں بھرپور کوششیں کیں۔ یہ غالباً ان پاکباز لوگوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ دو تین سو سال کی غلامی کے بعد بھی مسلمانوں کا اسلام سے کسی نہ کسی طرح تعلق باقی ہے۔ اور ان کی معاشرتی زندگی میں اس کے واضح اثرات دکھائی دیتے ہیں۔

تیسرے اسلام سے وابستگی کی وجہ سے مسلمانوں کے اندر کوئی ایسی قیادت اُبھرنے کی جرات نہ کر سکتی تھی جو دینِ حق کے ماسوا کسی نظامِ باطل کی علیحدہ دار ہو۔ مسلمان ایک چیز ہی جانتے تھے کہ سو فیصد حقِ اسلام اور صرف اسلام ہے۔ اس کی مخلصانہ پیروی سے ان کی دنیوی اور اخروی فلاح وابستہ ہے۔ یہی ان کی قوت کا واحد محرک تھا اور ان کے سارے دکھوں کا مداوا ہے۔ اس لیے انہیں اصلاحِ احوال کے لیے صرف اس کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ اس دین کے مقابلے میں ان کی نظر میں ہر چیز بیچ بلکہ فضول تھی۔ یہ بات کبھی ان کے حاشیہ خیال میں بھی نہ آ سکتی تھی کہ اس دین کو چھوڑ کر وہ کبھی خیر اور بھلائی کی راہ پاسکتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ کسی شخص کو یہ بہت نہ پڑتی تھی کہ وہ اسلام کے علاوہ کسی دوسرے نعرے پر مسلمانوں کو اپنے گرد جمع کر سکے۔ جو فرد بھی اس ملت کی محبت کا دم بھرتا اسے سب سے پہلے یہ ثابت کرنا پڑتا

کہ اس کا دل اسلام کی محبت سے معمور ہے اور وہ فکر و نگاہ اور سیرت و کردار کے اعتبار سے مسلمان ہے۔
 یہی وجہ ہے کہ ہماری پوری تاریخ میں مسلم قیادت ایک خاص دینی مزاج اور اخلاقی معیار کی حامل رہی
 ہے۔ دوسرے ممالک کو چھوڑتے خود اس برصغیر پاک و ہند میں دیکھیے کہ مسلمانوں کے اندر گذشتہ دو سو سال
 میں کس قسم کی قیادت ابھرتی رہی۔ شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان جس کے ہاتھ میں ایک طویل مدت تک
 مسلمانوں کی سربراہی کا منصب رہا اُس کی دینی خدمت سے کون مسلمان ناواقف ہے اُس کی مساعی نے شاہ سہیل
 شہید اور سید احمد بریلوی جیسے مجاہدین اسلام کو پیدا کیا۔ دیوبند، ندوہ، علی گڑھ بھی اچلتے اسلام کی کوششوں
 کے مختلف مظاہر ہیں۔ سو یکِ خلافت نے محمد علی جوہر، ظفر علی اور اسی طرح کے دوسرے انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانوں
 کو مولانا بنا دیا۔ اقبال مرحوم اور قائد اعظم اسلام سے تعلق کی وجہ سے مسلمانوں میں مقبول ہوئے اور اسی
 نسبت کی بنا پر پوری قوم نے نہ صرف انہیں سرانگھوں پر بٹھایا بلکہ اُن کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اُن کے
 ساتھ جدوجہد میں شریک ہوئے۔

اسے مسلم قوم کی بدقسمتی کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ خلافت کی قیابا کے ساتھ ہی مسلمانوں
 کے اندر ایک بین الاقوامی برادری سے تعلق رکھنے کا احساس آہستہ آہستہ ختم ہونے لگا اور انھوں نے بھی مغربی
 اقوام کی پیروی میں وطن، زبان اور نسل کو اپنی قومیت کی بنیاد سمجھ کر مادی اور وطنی مفادات کو اسلامی
 روابط پر ترجیح دینا شروع کیا۔ اور اس طرح ملتِ اسلامیہ چھوٹی چھوٹی قومیتوں میں بٹ کر رہ گئی۔
 ان نئی بنیادوں پر قومیت کی تشکیل کے لیے صرف یہی بات کافی نہ تھی کہ ایک خطہ ارضی کے رہنے
 والے مسلمان اپنے اپنے ملک کے اندر سمٹ کر بیٹھ جائیں اور وہاں اسلام کے تقاضوں کو کسی نہ کسی طور
 پورا کرتے رہیں بلکہ اس نئی قومیت کے مطالبات کو پورا کرنے کے لیے انہیں اپنے اندر وہ سارے منفی
 جذبات پالنے پڑے جو مغرب کی جارحانہ قوم پرستی کے لیے بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ ذیل میں ہم اُن
 کی مختصر اٹناطیں نشاندہی کرتے ہیں۔

انسان جس سرزمین میں پیدا ہوتا ہے اُس سے اُسے بالکل فطری طور پر محبت ہوتی ہے ایک مسلمان

بھی اس جذبہ سے محروم نہیں ہو سکتا مگر نئی قومیت نے وطن کی محبت کے بجائے وطن کی پریشانی کا پرچار کیا اور خاکِ وطن سے اُس طرح کا تعلق پیدا کرنے کی تلقین کی جس طرح کہ کوئی ندا پرست اپنے معبودِ تھنقی سے پیدا کرتا ہے۔ اس سے ایک تو انسان زندگی کی اعلیٰ اور ارفع قدروں سے بیگانہ ہوتے کیونکہ وطن اور اہل وطن کے مادی مفادات ان کے لیے دنیا کی ہر چیز سے عزیز تر قرار پاتے۔ دوسرے انہوں نے پوری انسانیت سے کٹ کر ایک محدود دائرے کے اندر رہنا اور اس کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ اُس طرح ان کے اندر تنگ نظری اور تعصب پیدا ہوا۔ ان کے نزدیک انسان کہلانے کے صرف وہی لوگ مستحق تھے جو ان کے ملک کی چار دیواری کے اندر رہنے والے تھے باقی انسان اُن کی نگاہ میں انسانیت کے شرف سے کبیر محروم تھے۔ اس طرزِ فکر کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کے ہر ملک کے بسنے والوں نے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تشکیل اس بیچ پر کی جس سے اس قسم کے منفی جذبات کو تقویت حاصل ہو۔ نظامِ تعلیم بھی اسی مقصد کو سامنے رکھ کر مرتب کیا جانے لگا۔ مختلف ممالک میں دستور و آئین کے جوڈھانچے تیار ہوئے وہ بھی ہر قوم نے اپنے مخصوص قومی مفادات کے پیش نظر تیار کیے۔ الغرض دنیا میں کسی ایک جگہ بھی انسانوں کا کوئی ایسا گروہ موجود نہ رہا جنہیں انسانیت اور اُس کے وسیع تر مفادات سے محبت ہو۔ پوری دنیا تعصبات سے بھر گئی۔

ان منفی جذبات کے اندر زیادہ زور اور توانائی پیدا کرنے کے لیے یہ بات ضروری تھی کہ دنیا کی ہر قوم دوسری اقوام کے خلاف پوری شدت سے نفرت کی آگ بھڑکائے کیونکہ اس نفرت ہی سے اس کے اندر اتفاق و اتحاد کی راہ ہموار ہو سکتی تھی۔ اسی غرض کے لیے سب سے آسان طریقہ تھا کہ کسی طرح اپنے آپ کو مظلوم اور دوسری قوموں کو ظالم ثابت کیا جاتا۔ کسی مظلوم قوم کو توخیر یہ حتیٰ ہے کہ وہ ظالم قوم کی ظلم و زیادتی کے خلاف آواز بلند کرے اور اپنے عوام کے اندر یہ احساس پیدا کرے کہ انہیں اس سے نجات ملنی چاہیے مگر جارحانہ قوم پرستی کے اس جنوں نے قوموں کے اخلاق کو اس حد تک تباہ کر دیا ہے کہ ظالم قومیں بھی بڑی بے شرمی کے ساتھ اپنے مظلوم ہونے کی دہائی دیتی ہیں اور نئی حقیقت جو قومیں ظلم کا شکار ہو رہی ہیں اُن کی طرف، بعض جھوٹی باتیں منسوب کر کے ان کی چیرہ دستیوں کے افسانے

گھر کر انہیں پہلے تو بدنام کرتی ہیں اور پھر ان جھوٹے اور بے بنیاد الزامات کی آڑ کے ان پر دستِ ظلم و راز کرنے لگتی ہیں۔

ظاہرات ہے کہ کسی قوم کے اندر اس قسم کے غلط رجحانات اخلاقی احساس رکھنے والے اور انسانیت کے بے خواہ تو نہیں پھیل سکتے۔ اس منفی کام کی انجام دہی کے لیے وہی لوگ زیادہ موزوں ہو سکتے ہیں جو منتعصب، تنگ نظر اور پرلے درجے کے حریفوں، جو عوام کے جذبات سے کھیلنے میں بڑی مہارت اور چابکدستی رکھتے ہوں، جن کے دل میں نام و نمود اور اقتدار کی خواہش کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہو اور اس خواہش کی تکمیل کے لیے وہ تمام ایسے کام کرنے پر تیار ہوں جن سے کسی ملک کی فضا میں سنسنی پیدا کی جاسکے اور اخلاقی اعتبار سے اس قدر دیوالیہ ہوں کہ اگر انہیں اپنے آپ کو نمایاں کرنے کے لیے پوری قوم کے مفاد کو دائوں پر لگانا چڑے تو اس میں بھی انہیں قطعاً کوئی باک محسوس نہ ہو۔

دورِ جدید میں مختلف ممالک کے اندر ابھرنے والی قیادتوں پر اگر نگاہ ڈالیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ ان میں سے اکثریت ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جنہیں قوم کے اندر منفی جذبات کی پرورش کرنے میں کمال حاصل ہے۔ ایسے لوگوں نے کبھی بھی قوت اور مہمت کے ساتھ قوم کے غلط رجحانات کو صحیح رخ پر موڑنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ان رجحانات میں مزید بگاڑ پیدا کر کے قوم کو بڑی تیزی کے ساتھ بربادی کی راہ پر دھکیلنے کا سامان کیا ہے۔ یہ طالع آزار سبنا سب سے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ قوم کے مختلف طبقوں کے اندر کیا کیا خامیاں پائی جاتی ہیں اور انہیں کن کن محرومیوں کا احساس ہے۔ ان دو چیزوں کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد پھر یہ لوگ ان خامیوں اور محرومیوں سے خوب فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان رہنماؤں کا حال ان نشہ آور اشیاء فروخت کرنے والوں کا سا ہے جو ہر وقت نہ صرف گاہکوں کی تلاش میں لگے رہتے ہیں بلکہ نئے نئے گاہک تیار کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ اس غلط ذہنیت کے لوگ آخر عوام کی اصلاح کس طرح کر سکتے ہیں۔ ایک صحیح قائد کا فرض تو یہ ہے کہ قوم جن جن برائیوں میں گرفتار ہے وہ ان کی نشاندہی کرے، ان کے خلاف عوام کے اندر گہرا احساس پیدا کرے اور پھر انہیں اس بات

پر آمادہ کرے کہ انہیں ان بُرائیوں سے نجات حاصل کرنی ہے۔ مگر یہ کام بڑا سبب آزماتا کام ہے۔ قوم کو اچھے اور پاکیزہ مقصد کی خاطر اپنے پیچھے لگانے کے لیے قائد کو نہ صرف بڑے اثار سے کام لینا پڑتا ہے بلکہ خود اپنے آپ کو اچھی سیرت کا نمونہ بھی بنانا پڑتا ہے۔ اس ایجابی کام سے دوسرا سببی کام بہت زیادہ سہل اور آسان ہے، یعنی قوم جس غلط راہ پر گامزن ہے اسے نہ صرف اس پر چلنے دیا جائے بلکہ اس غلط سمت میں اس سے آگے بڑھ کر اُسے پیچھے لگا لیا جائے۔ جس طرح ایک شرابی شراب کے نشے میں بدمست ہو کر اپنا حقیقی خیر خواہ اس شخص کو خیال کرتا ہے جو اُس کے لیے اس ام العنایت کے زیادہ سے زیادہ جام لٹدھا سکے اور وہ اُس شخص کو اپنا دشمن تصور کرتا ہے جو اسے اس بُرائی سے باز رہنے کی تلقین کرے، بالکل اسی طرح جب کسی قوم کے اندر بگاڑ پیدا ہوتا ہے تو وہ ان لوگوں کی قیادت اور سیادت قبول کرتی ہے جو انہیں بگاڑ سے نکالنے کے بجائے اس میں مزید بگاڑ پیدا کرنے کی بدرجہ اتم صلاحیت رکھتے ہوں۔ وہ عقل کی بات سمجھانے والوں کو اپنا دشمن اور بربادی کی راہ پر لے جانے والوں کو اپنا ہی خواہ خیال کرتی ہے۔ گذشتہ دو سو سال میں دنیا کے اندر جس قدر تباہی آئی ہے اور انسانیت کو جو بے پناہ مصائب پھیلنے پڑے ہیں وہ سب اس غلط قیادت کی بیجان انجینریوں کے بالکل فطری ثمرات ہیں۔

مسلمان قوم کے لیے اُس دن سے زیادہ کوئی منحوس دن نہ تھا جب اُس کے اندر جارجا نہ قوم پرستی کے جراثیم پھیلنے شروع ہوئے۔ مغربی اقوام خصوصاً یہودی عرصہ دراز سے اس ٹوہ میں لگے ہوئے تھے کہ وہ کوئی ایسی تدبیر سوچ سکتی ہے جو مسلمانوں کے خیرازہ کو منتشر کر سکے۔ اس ناپاک مقصد کے حصول کے لیے یوں تو مختلف ہتھکنڈے استعمال کیے جاتے رہے اور اب بھی کیے جا رہے ہیں مگر ان میں سب سے زیادہ مؤثر اور نتیجہ خیز تجویز یہی تھی کہ کسی طرح مسلمانوں کے اندر مغربی قومیت کے تصورات کو رواج دیا جائے کیونکہ اُن کے سرایت کر جانے کے بعد انہیں کوئی چیز تباہ ہونے سے بچا نہ سکے گی۔ پھر یہ کام بھی نسبتاً آسان ہے اور اسے غیر محسوس طور پر بغیر خطرے کا

کوئی الایم پیدا کیسے آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔ اسلام کے دشمنوں نے اس کا آغاز وطن کی محبت کے فطری جذبے سے کیا۔ پھر مسلمانوں کے اندر یہ احساس پیدا کیا کہ وطن کے مفادات دوسرے سارے مفادات سے عزیز تر ہونے چاہئیں اور کسی دوسرے ملک کے رہنے والے مسلمان اس بات کا حق نہیں رکھتے کہ ان کی خاطر انہیں قربان کیا جاسکے۔ اسلام کا رشتہ مقدس سہی مگر اسے وطن کے رشتے پر غالب نہ آنے دیا جائے۔ اسی طرح آہستہ آہستہ مسلمانوں کے اندر وطن پرستی کے جذبات پیدا کیے گئے۔ مسلم قوم کے اندر اسلام نے جس احساس کی آبیاری کی تھی وہ یہ تھی کہ اُس کے ہر فرد کو اول و آخر مسلمان ہونا چاہیے اور اللہ کے دین کی خاطر ہی اسے زندہ رہنا اور مرنا چاہیے۔ اس ایک مقصد کے مقابلے میں باقی سب مقاصد غلط اور بیکار ہیں پھر آہستہ آہستہ خدا کی محبت کے ساتھ وطن کی محبت کا سلسلہ شروع ہوا اور دینی مفادات کے پہلو بہ پہلو وطنی مفادات بھی اُبھرنے لگے۔ مگر یہ صورتِ سال زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی، کیونکہ دنیا کی ہر قوم کو قدم قدم پر یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ اُس کے نزدیک زندگی کا اہم ترین مقصد کونسا ہے اور اس کی روشنی میں اس کی سب سے قیمتی متاع کیا ہے اور اسے حاصل کرنے کے لیے اسے جدوجہد کا کونسا انداز اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کو بھی وطن پرستی اور خدا پرستی، دینی تقاضوں اور وطنی مفادات کے درمیان جلد فیصلہ کرنا پڑا کیونکہ یہ فیصلہ کیے بغیر ان کا زندہ رہنا ممکن نہ تھا۔ انہوں نے شروع میں تو اس ذہنی کشمکش کو ملت اور قوم کے درمیان لفظی تفریق کر کے اُسے چھپانے کی کوشش کی مگر خدا کی پرستش اور وطن کی پرستش کو چونکہ بیک وقت نبھانا ناممکنات میں سے ہے اس لیے انہوں نے جلد ہی یہ کہنا شروع کر دیا کہ وہ پہلے وطن کے پرستار ہیں اور بعد میں خداوند تعالیٰ کے اطاعت شعار مغرب نے قومیت کا جو نیا مذہب پیش کیا ہے اس میں یوں تو سوائے مذہب و وطنیت کے کسی دوسرے جاندار مذہب کے وجود کی کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی مگر خاص طور پر اسلام کو تو وہاں کسی صورت بھی گوارا نہیں کیا جاسکتا۔ اسلام ایک ہمہ گیر نظام حیات ہے جو زندگی کے سارے گوشوں پر حاوی ہے۔ وہ وطن کے بارے میں بھی ایک خاص زاویہ نگاہ رکھتا ہے جو اس فلسفے سے براہِ راست متضاد ہے جسے مغربی قوم پرستی نے جنم دیا ہے اس لیے وہ قوم جو ایک ہی وقت میں اسلام اور مغربی قومیت کے نظریہ کو اپنانے کی کوشش کرتی ہے

وہ جلد از جلد انتشار کا شکار ہو جاتی ہے۔ اگر وہ ملکی اور قومی مفادات کو اولیت کا درجہ دیتی ہے تو اسے بہت سے دینی تقاضے پس پشت ڈالنے پڑتے ہیں اور اگر وہ دینی تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کرتی ہے تو وہ بہت سے قومی مفادات نظر انداز کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ جس طرح کوئی فرد بیک وقت دو مخالف سمت میں چلنے والی کشتیوں میں پاؤں نہیں رکھ سکتا بالکل اسی طرح ملت اسلامیہ اسلام اور مغربی قومیت کو ایک ہی وقت میں اپنا کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اسے دونوں میں بہر حال ایک کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ دو تین ممالک کو چھوڑ کر دنیا کے تمام مسلم ممالک نے وطن پرستی کا مسک اختیار کیا۔ اور اس کے تقاضوں کے تحت اپنی قومی زندگی کی تشکیل شروع کی۔ اسلام وہاں سے بالکل نیست و نابود تو نہ ہو سکا مگر وہ کوئی انقلاب انگیز قوت کی حیثیت سے بھی باقی نہ رہا۔ وہاں کے عوام نے اسے چند بے جان رسوم کا مجموعہ سمجھ کر اپنے سینے سے لگائے رکھا۔ اس حیثیت میں آخر کوئی دین کتنے دنوں تک زندہ رہ سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ کا دین و وطنیت کے ہر آن بڑھتے ہوئے تقاضوں کے پیش نظر زندگی کے ہر میدان میں اپنی بساط پھینچا گیا اور بالآخر مسلم ممالک میں بالکل مغلوب و منطوق ہو کر رہ گیا۔

جو دو تین مسلم ممالک وطن پرستی کے اس حملے سے محفوظ رہے ان میں سر غیرت پاکستان ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ یہ ملک وطن پرستی کے خلاف مسلح جہاد اور اس دین باطل پر دین حق کے تسلط اور غلبے کے نتیجے میں معرض وجود میں آیا ہے تو یہ زیادہ صحیح ہوگا۔ یہ قدرت کا ایک بہت بڑا کرشمہ ہے کہ برصغیر ہندو پاک کی جو زمین مذہب و وطنیت کی عملداری کے لیے سب سے زیادہ موزوں تھی اسی میں اٹنے سکتا اٹھا پڑی اور یہاں مسلمانوں نے اس حقیقت کو ثابت کر دیا کہ اسلام کا رشتہ خاک و خون کے رشتوں سے کہیں زیادہ مضبوط اور قوی ہے۔ جن ممالک میں مسلمانوں کی آبادی نونے اور اتنی فیصد ہے وہاں تو انہوں نے مذہب کے ثبوت کی پرتش شروع کر دی ہے مگر جن ملک میں ان کی آبادی ۲۵ فیصد سے بھی کم تھی وہاں انہیں اللہ تعالیٰ نے علم حق بلند کرنے کی توفیق دی اور انہوں نے اللہ کے مطیع و فرمانبردار بندوں کی طرح پوری دنیا کے سامنے یہ موقف اختیار کیا کہ وہ اول و آخر مسلمان ہیں۔ وطن سے انہیں بھی محبت ہے مگر اس محبت کا

یہ مطلب نہیں کہ وہ فلسفہ وطنیت کی کوئی ایسی صورت گوارا کریں جو اسلامی تعلیمات سے متصادم ہو۔ جوہ آزادی وطن اور تعمیر وطن کے لیے اپنے سامنے جو نقشہ رکھتے ہیں اُس میں اسلام نے رنگ بھرا ہے۔ وہ وطنی تقاضوں سے صرف نظر کرنا نہیں چاہتے مگر انہیں اس انداز سے پورا کرنے کے آرزو مند ہیں جو اسلام نے سکھایا ہے۔ ان کی قوت کے چشے خاکِ وطن کی محبت سے نہیں اُبلتے بلکہ خدا اور اس کے رسول کی محبت سے اُبلتے ہیں۔ اللہ کے دین نے جو حیثیت وطن کو دی ہے وہ اسے اسی حیثیت پر رکھنے کے متمنی ہیں۔ اسے خدا کے مقام پر فائز کرنے کے لیے کسی صورت بھی تیار نہیں ہو سکتے کیونکہ یہ ان کے نزدیک کفر ہے۔

وطن پرستی کے اس دور میں یہ نظریہ پوری دنیا کے لیے بڑا حیران کن تھا مگر اس بصرِ غیر کے مسلمانوں کے لیے یہ اُن کے دل کی آواز تھی۔ انہیں بعض تاریخی اسباب کی وجہ سے اس دین کی اہمیت کا پوری طرح احساس تھا۔ وہ اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے کہ اس دین کی بدولت ان کا الگ ملی وجود قائم ہے اور وہ ہندو قومیت کی مینا سے محضوٹ ہیں۔ اس سرزمین میں لاتعداد قومیں نمودار ہوئیں مگر ان کا کوئی نام و نشان باقی نہیں رہا۔ انہیں نہ تو زمین نکل گئی ہے اور نہ آسمان اُچک کر لے گیا ہے بلکہ انہیں ہندو قومیت کا دیواستیداد نکل گیا۔ مگر مسلم قوم نے اسلام کی قوت کی وجہ سے اس دیو کے دانت کھٹے کر دیئے اور اس سے یہ بات تسلیم کر والی ہے کہ اسے ایک الگ قوم کی حیثیت سے ایک علیحدہ وطن میں باعزت طور پر جینے کا حق ہے۔

پاک و ہند کی سرزمین میں مسلمانوں پر اسلام کا دوسرا بڑا احسان یہ رہا ہے کہ اُن کے ہاں نہ تو آج سے پہلے ملحدانہ تحریکات کی پذیرائی ہوئی اور نہ الحاد کی علیہ وارقیادت کو سراٹھانے کا موقع ملا جس نہریک یا جس شخصیت کا اسلام سے جس قدر تعلق کم تھا اسے مسلم قوم کے اجتماعی ضمیر نے اسی نسبت سے مسترد کر دیا۔ مسلم معاشرے نے بعض بڑے نامور مفکر، ادیب، سیاستدان اور منتظین پیدا کیے مگر مسلمانوں نے ان میں کسی ایک کی بھی محض اس وصف کی بنا پر پذیرائی نہیں کی بلکہ انہیں اگر اپنے دل میں عزت و احترام کا کوئی مقام دیا تو اس کی وجہ ان کی اللہ کے دین سے وابستگی تھی۔ اس حقیقت کو جاننے کے لیے کسی ایسی چڑھی محنت

کی ضرورت نہیں۔ اس ملک کی تاریخ پر سرسری نگاہ ڈالنے سے اس کے بے شمار ثبوت فراہم کیے جاسکتے ہیں۔ مثلاً یہ دیکھیے کہ اس برصغیر میں مسلم قوم میں کتنے ایسے صاحب اختیار بادشاہ پیدا ہوئے ہیں جو اپنی قوت و طاقت کے اعتبار سے غیر معمولی طور پر نمایاں تھے مگر ان بادشاہوں کے مقابلے میں شہرت و ناموری ان بزرگانِ خدا کے حصے میں آئی ہے جن کا سرمایہ بجز زہد و تقویٰ کے اور کوئی چیز نہ تھی۔ اکبر اور جہانگیر کے مقابلے میں مجدد الف ثانی کی بے مثال مقبولیت اس دعویٰ کی واضح شہادت پیش کرتی ہے۔ پھر خود ان بادشاہوں کے درمیان مسلمانوں نے صرف دین کی بنیاد پر تفریق کی اور جسے جس قدر دین کے قریب پایا اسے اسی قدر عزت و تکریم کی نگاہ سے دیکھا اور جسے دین سے جس قدر دور پایا اسی تناسب سے اس کے خلاف نفرت کا اظہار کیا۔ ناصر الدین محمود کے بارے میں مسلمان جو عقیدت کے نہایت گہرے جذبات رکھتے ہیں اس کی وجہ سوائے اس فقیر بادشاہ کی پرہیزگاری اور خدا ترسی کے اور کیا ہے اور جلال الدین اکبر اپنی ساری صلاحیتوں اور انتظامی کارناموں کے باوجود اگر مسلمانوں کی نظر میں قابلِ نفرت ہے تو اس کا سبب بھی اس کا دین حق سے انحراف ہے۔

مسلم حکومت کے خاتمے کے بعد بھی مسلمانوں کے اس طرزِ فکر میں کوئی خاص تبدیلی پیدا نہ ہوئی۔ انہوں نے بلاشبہ اسلام کے نام پر بعض تحریکیں اور بعض شخصیتوں کے بارے میں دھوکہ کھایا مگر اسلام کو ان کے ہاں ہمیشہ اہمیت کا مقام ہی حاصل رہا۔ مغرب کی الحاد پرستی نے اس قوم میں بڑے ضرر رساں اثرات مرتب کیے مگر اس قوم نے اپنی ساری اعتقادی اور عملی کوتاہیوں کے باوجود اسلام سے بغاوت کی راہ اختیار نہ کی بلکہ اس کے دل میں ہمیشہ یہ خواہش موجزن رہی کہ اس کی اجتماعی زندگی کی تعمیر اسلام کی بنیاد پر ہونی چاہیے۔ اسی خواہش کی تکمیل میں یہاں کے مسلمانوں نے مختلف ادوار میں مختلف دائروں میں جدوجہد کی۔ خود پاکستان کا وجود اس خواہش کا مظہر ہے۔ یہ ایک ایسا ملک ہے جس کے مختلف حصوں کے مابین سوائے اسلام کے رشتے کے اور کوئی دوسرا ایسا رشتہ موجود نہیں جو انہیں ایک دوسرے سے جوڑ سکے۔ یہ دو ایسے بازوؤں پر مشتمل ہے جن کے درمیان ایک ہزار میل کا فاصلہ حاصل ہے اور یچ میں ایک ایسی قوم کا غلبہ ہے جسے اسلام اور مسلمان کا نام بھی گوارا نہیں پھر ان دونوں بازوؤں میں جو لوگ آباد ہیں ان میں بھی کوئی چیز ذاتی ہے۔

یقینہ اشارات

قدر مشترک کی حیثیت نہیں رکھتی ان کی زبانیں ایک دوسرے سے انگ، ان کے اطوار ایک دوسرے سے جدا، ان کے رنگ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ پھر یہ وسیع اختلاف دونوں بازوؤں تک ہی محدود نہیں بلکہ خود مغربی بازو جن علاقوں پر محیط ہے وہاں کے رہنے والوں میں بھی ماسوائے اسلام کی مفناطیسی قوت کے کوئی دوسری ایسی قوت موجود نہیں جو ان نائل بہ انتشار اجزا کو ایک دوسرے سے وابستہ رکھ سکے۔ ان حالات میں اگر کوئی گروہ اسلام کے مقابلے میں علاقائی مفادات اور علاقائی تعصبات اُجھارنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو وہ پاکستان کو مسمار کر دیتا ہے کیونکہ اسلام کے بغیر پاکستان کو کوئی دوسری قوت متحد نہیں رکھ سکتی۔

دنیا کی ساری اسلام دشمن طاقتیں پاکستان کی اس مخصوص صورتِ حال سے واقف ہیں۔ پھر انہیں اس بات کا بھی واضح شعور ہے کہ یہ ملک صرف اسلام کے نام پر معرضِ وجود میں آیا اور یہ اسلام کے دئیے ہوئے تصورِ قومیت کا عملی اظہار ہے اس لیے وہ شروع ہی سے اس کی مخالفت پر کمر بستہ ہیں اور اسے برباد کرنے پر ادھار کھلتے بیٹھی ہیں۔ اسے وہ خلافتِ عثمانیہ کی طرح اسلام کا آخری حصار تصور کرتی ہیں اور اس بات کا پختہ یقین رکھتی ہیں کہ اگر وہ اسے مسمار کرنے میں کامیاب ہو گئیں تو پھر ایک دو ممالک جو ان کی پورش سے فی الحال بظاہر محفوظ دکھائی دیتے ہیں وہ بھی جلد ہی پیوندِ خاک ہو جائیں گے اور اس طرح ملتِ اسلامیہ کا شیرازہ بالکل منتشر ہو کر رہ جائے گا۔ ان ناپاک مقاصد کی خاطر یہ طاقتیں شروع ہی سے اسلام کے خلاف سازشیں کرنے میں مصروف چلی آ رہی ہیں۔ کہیں تو اسلام کے نام پر مغربی افکار و نظریات کو پروان چڑھانے کے لیے جدوجہد کی جا رہی ہے۔ کہیں معاشی عدلیٰ و انصاف کے پردے میں اتحاد کا پرچار کیا جا رہا ہے اور کہیں مادی مفادات کے نام پر علاقائی تعصبات کو اُبھار کر پاکستان کے اندر چھوٹی چھوٹی قومیتوں کو ختم دیا جا رہا ہے۔ ان سب کا مقصد ایک ہی ہے کہ کسی طرح یہاں کے عوام اسلام سے برگشتہ ہو کر، جو ان کی قوت کا اصل سرچشمہ ہے، خود اپنی بربادی کا سامان فراہم کریں۔ مختلف علاقوں میں رہنے والوں کے درمیان ایک دوسرے سے عداوت اور نفرت کے

رجحانات اچانک تو پیدا نہیں ہو گئے بلکہ یہ سب کچھ ایک نئے بندھے منصوبے کے تحت گذشتہ ۲۳ برس سے مسلسل کیا جا رہا ہے اور آج حالت یہاں تک پہنچی ہے کہ وہ قوم جس نے کبھی رنگ، وطن، نسل اور زبان کے بتوں کو پاش پاش کر کے صرف خدا پرستی کی بنیاد پر اپنی قومیت کا قصر تعمیر کیا تھا۔ آج ان چھوٹے بتوں کی پرستش پر آمادہ نظر آتی ہے، وہ قوم جو کبھی دنیا کے سارے مسلمانوں کو ایک ہی نژتہ اخوت میں منسلک سمجھ کر ان سب کے بارے میں بھائی چارے کے جذبات رکھتی تھی آج چھوٹے چھوٹے مفادات کی بنیاد پر مختلف قومیتوں میں بیٹنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔ اسے مادی مفادات کی محبت نے زندگی کی اعلیٰ اور ارفع قدروں سے یکسر غافل کر دیا ہے اور ایک کلمہ گو مسلمان دوسرے کلمہ گو مسلمان کا محض اس وجہ سے گلا کاٹنے میں مصروف ہے کہ ان دونوں کا تعلق ملک کے دو مختلف خطوں سے ہے۔ اس اندرونی صورت حال پر جس قدر ماتم کیا جائے کم ہے۔

ملک کو متحد رکھنے کے لیے اس وقت جو کوشش بھی کی جائے وہ قابلِ ستائش ہے کیونکہ اسلام دشمن طاقتیں تو منہ کھولے اس انتظار میں بیٹھی ہیں کہ کب یہ ملک پارہ پارہ ہو کر ان کے لیے نر تو الہ بن جائے تاکہ وہ اسے آسانی سے نکل سکیں۔ وہ پہلی منزل پر تو مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے الگ کرنا چاہتی ہیں کیونکہ اس منزل پر اگر وہ کامیاب ہو جائیں تو اس ملک کے مزید حصے بخرے کرنے میں انہیں کوئی خاص دقت نہ ہوگی کیونکہ جن مادی مفادات اور جن ریشٹوں اور دل کی جن کدو زنیوں کی بنا پر وہ ان دو بڑے خطوں کے مابین افریق پیدا کریں گی ان کی بنیاد پر ہی وہ پھر مغربی پاکستان میں انتشار کے بیج بونے میں کامیاب ہوگی خدا سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ دشمنوں کے ان منصوبوں کو ناکام بنائے اور اس ملک کی قیادت کو اخلاص اور عقل و تدبیر عطا فرمائے اور عوام کو ان مصائب سے بچائے جن کا اس خلفشار کے نتیجے میں پیدا ہونا ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ہم اس ملک کے ہر درد مند شہری سے اس بات کی اپیل کرتے ہیں کہ وہ خدا را اس عظیم نصیحت کی صحیح قدر کو پہچاننے کی کوشش کرے جس کی وجہ سے ان کے اندر کسی پائیدار اتحاد کی بجائے بے رونق کی جاسکتی ہے۔ اسلام کے بغیر پاکستان کا تصور خواب پریشان سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔